مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

مترجم

ڈاکٹر حافظ نصر اللہ فیضی ایم. اے. پی. ایچ. ڈی

ناشر

صوبائی جمعیت اہلِ حدیث، ممبئی

اسلام
اور
اھنسا

ایک لاجواب تقریر اور ایک ان کہی داستان

اسلامی اور غیر اسلامی تہذیب کے چہروں کا دلچسپ تقابل

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

ناشر:

صوبائی جمعیت اھلحدیث، ممبئی

طبع اول : ۲۰۰۰

سن اشاعت اول: ۱۹۸۵ء

''بنارس راجگھاٹ کے پاس گنگا اور برنا ندی کے سنگم پر گاندھی جی کے فلسفہ کی تشہیر وتبلیغ کے لئے گاندھین انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے، جہاں دیگر پروگراموں کے علاوہ وقتاً فوقتاً مقررہ عنوانات پر تقریریں بھی کرائی جاتی ہیں۔ ۹/ اگست ۱۹۸۴ء کو مذکورہ عنوان پر مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری سے تقریر کرائی گئی۔ ذیل میں یہی تقریر بہ شکل رسالہ پیش کی جارہی ہے''۔

نام کتاب	:	اسلام اور اہنسا
مولف	:	مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری
سن اشاعت	:	اکتوبر ۲۰۰۶ء
ناشر	:	صوبائی جمعیت اہلحدیث ممبئی
پتہ	:	بلاک نمبر A/1 آشیانہ کوآپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹی،
		ایل۔بی۔ایس۔مارگ، کرلا (مغرب) ممبئی۔۴۰۰۰۷۰۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد:

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے گاندھی جی کے ایک اصول کے تعلق سے ہنسا اور اہنسا یا تشدد اور عدم تشدد کا لفظ بار بار سنا ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ ڈکشنری میں اس لفظ کا جو معنیٰ آتا ہے گاندھی جی اس معنیٰ میں اہنسا کو مانتے تھے یا ان کے یہاں اس کے کچھ اصول، ضابطے، شرطیں اور حدیں بھی تھیں۔ لیکن آج کی مجلس میں مجھے اس کی تلاش بھی نہیں، بلکہ مجھے ہنسا اور اہنسا کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنی ہے۔

البتہ اصل معاملے پر کچھ کہنے سے پہلے ایک بات واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے، دین فطرت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر جو تقاضے رکھے گئے ہیں اسلام نے ان سب کی رعایت کی ہے، یعنی انہیں کچل کر ختم نہیں کیا ہے بلکہ ان کے لئے ایسا صحیح راستہ بتایا ہے کہ انسان کی فطرت کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں اور انسانی سماج میں اس سے کوئی برائی بھی جنم نہ لے بلکہ انسانی سماج کو فائدہ ہی پہنچے۔

اس بات کو سامنے رکھ کر پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ تشدد اور عدم تشدد کے بارے میں انسان کی فطرت کیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ کوئی بھی انسان یہ نہیں چاہتا کہ اس کی جان ماری جائے یا اس کے ہاتھ پاؤں توڑے جائیں، اسے مارا پیٹا جائے یا اس کا دھن دولت چھین لیا

جائے یا اسے بے عزت کیا جائے ، مثلاً اسے گالی دی جائے ، اس پر کوئی برا الزام لگایا جائے اور انسانی سوسائٹی میں اسے رسوا کیا جائے ، یعنی ہر انسان اپنی تین چیزوں کا بچاؤ چاہتا ہے، ایک یہ کہ اس کا جسم اور جان محفوظ رہے، دوسرے یہ کہ اس کا مال محفوظ رہے اور تیسرے یہ کہ اس کی عزت محفوظ رہے، یہ انسان کی فطرت (نیچر) ہے۔

مگر یہ انسان کی فطرت کا صرف ایک پہلو ہے، اس کے علاوہ ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی انسان کو جان سے مار ڈالا جائے تو اس کے باپ بیٹے اور گھرانے کے لوگ یہی چاہیں گے کہ مارنے والے سے اس کا بدلہ لے لیں۔ یہ لوگ چاہے جتنے بھی کمزور ہوں اور مارنے والے جتنے بھی طاقتور ہوں، مگر جہاں تک ہو سکے گا بدلہ لینے کی کوشش اور جتن کریں گے، اور اگر حالات سے مجبور ہو کر چپ سادھ بھی لیں تو ان کے دل میں اس کی حسرت اور کسک برابر باقی رہے گی ، اور انہیں ذرا بھی چھیڑ دیجئے تو اپنا دکھڑا سنانا شروع کر دیں گے اور دل کی آہ زبان پر آ جائے گی، لیکن اگر بدلہ مل جائے تو ان کے دل میں حسرت نہیں رہ جائے گی بلکہ انہیں اطمینان ہو جائے گا کہ انصاف مل گیا۔

یہی صورت اس وقت بھی ہوتی ہے جب کسی کا ہاتھ پاؤں توڑ دیا جائے، یا اسے مارا پیٹا جائے یا اس کا مال چھین لیا جائے۔

یہ مظلوم جب تک ظالم سے بدلہ نہ لے لے اسے چین نہیں ملتا اور اس کی آہ نہیں جاتی، اسی طرح کوئی کسی کو گالی دیدے، یا مثلاً اس کی ماں پر تہمت لگا دے یا اور کسی ذریعہ سے بے عزت کردے تو وہ اسے آسانی سے برداشت نہیں کر سکتا، بلکہ جوابی کارروائی کرے گا، اور اگر نہ کر سکا تو کڑھ کڑھ کر رہے گا اور من ہی من میں گالیاں دے گا، یہ ایسی حقیقتیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں انسان کی فطرت یہ ہے کہ اس کا جسم و جان، مال و دولت اور عزت و آبرو محفوظ رہے وہیں انسان کی فطرت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص ان تینوں میں کسی ایک چیز پر حملہ کردے تو اس سے بدلہ لیا جائے۔ اور اگر وہ کود خود بدلہ نہ لے سکے تو اس کو بدلہ دلایا جائے۔ اس لئے انسانی سماج کو کوئی ایسا نظام دیا جائے جس میں انسانی فطرت کے ان دونوں پہلوؤں کی رعایت کی گئی ہو تو وہ نظام کامیابی سے چل سکتا ہے، لیکن اگر کوئی ایسا نظام بنایا جائے جس میں ان دونوں میں سے کسی ایک بھی پہلو کو چھوڑ دیا گیا ہو تو وہ نظام فیل ہو جائے گا اور کسی قیمت پر نہیں چل سکے گا۔

اس وضاحت کے بعد اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اس نے انسانی فطرت کے ان دونوں پہلوؤں کی پوری پوری رعایت کی ہے۔ یعنی آپ پہلے پہلو کو لیجئے تو اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی شخص کسی کی جان یا مال یا آبرو پر حملہ کردے، بلکہ اسلام نے نہایت سختی سے اس کی ممانعت کی ہے، اور اسے بہت ہی برا اور گھناؤنا جرم قرار دیا ہے۔ میں اس بارے میں اسلام کی اصل کتاب قرآن مجید اور حدیث سے دو تین حوالے پیش کردینا چاہتا ہوں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ اسلام کے نزدیک ان جرائم کی حیثیت کیا ہے۔ قرآن میں پچھلے زمانے کی ایک قوم کا ذکر کرتے ہوئے ایک اصول بیان کیا گیا ہے:

﴿أنه من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعاً ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا﴾ (المائدہ:۳۲)۔

یعنی جس نے کسی ایک جان کو بھی قتل کردیا اور ایسا نہ تو کسی جان کے بدلہ لینے کے لئے کیا اور نہ زمین میں پھیلے ہوئے فساد سے نمٹنے کے لئے کیا تو اس نے گویا سارے انسانوں کو قتل

کردیا اور جس نے ایک جان کو زندہ بچالیا اس نے گویا سارے انسانوں کو زندہ بچالیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی شروعات کے طور پر کسی ایک بھی آدمی کو قتل کردے تو وہ اتنا بڑا جرم ہے کہ گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کردیا، کیونکہ اس نے انسان کے قتل کا دروازہ کھولا، یہ ہے اسلام میں انسانی جان کا احترام۔

اسی طرح اسلام میں دوسرے کا مال کھانا بھی سخت حرام ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک بار محمد ﷺ کے پاس ایک جائداد کا مقدمہ آیا، آپ نے سمجھایا کہ دیکھو میں بھی انسان ہوں، ہوسکتا ہے کسی کے زور بیان کے وجہ سے اسے ڈگری دیدوں اور حقیقت میں مال اس کا نہ ہو، تو پھر سن لو کہ میں اسے آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کورٹ سے ڈگری بھی مل جائے تب بھی دوسرے کا مال کھانا اسلام کی نظر میں حرام اور نہایت ہی خطرناک جرم ہے، ایسا آدمی اِس دنیا میں اگر بچ بھی جائے تو اُس دنیا میں نہیں بچ سکتا۔

اب آدمی کی عزت و آبرو کا مسئلہ لیجئے، اسلام میں اس کی کتنی اہمیت ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار محمد ﷺ چند آدمیوں کے ساتھ جارہے تھے، پیچھے دو آدمیوں نے آپس میں باتیں کرتے کرتے ایک آدمی کو جو ایک سزا میں مارا گیا تھا، کتا کہہ دیا، محمد ﷺ کے کان میں یہ آواز پڑگئی، آپ تھوڑی دور گئے تو دیکھا کہ ایک گدھا مرا پڑا ہے اور اتنا پھول گیا ہے کہ ٹانگیں تن گئی ہیں، آپ رک گئے اور ان دونوں سے کہا جاؤ اس گدھے کا گوشت کھاؤ، وہ دونوں ہکا بکا رہ گئے کہ آخر ہم سے کیا جرم ہوگیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ابھی تم دونوں نے ایک آدمی کو جو کتا کہا تو وہ اس سڑے ہوئے گدھے کی لاش کھانے سے بھی زیادہ برا تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی کی عزت پر بٹہ لگانا اسلام میں کتنا بڑا جرم ہے۔

ابتک کی گفتگو اس پہلو سے تھی کہ اسلام میں کسی کی جان یا مال یا آبرو پر حملہ کرنے کی قطعاً

اجازت اور گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی آدمی اس ممانعت کے باوجود کسی کی جان یا مال یا آبرو پر حملہ کر بیٹھے تو اسلامی حکم یہ ہے کہ حملہ آور کو ایسی سزا دی جائے کہ مظلوم کو پورا پورا بدلہ مل جائے، لیکن حملہ کرنے والے پر بھی ظلم نہ ہو، یعنی اس نے جتنا بڑا جرم کیا ہے اس سے بڑی سزا نہ دی جائے، اس بارے میں یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ عدالت اور کورٹ کو یا ملک کے سربراہ کو مثلاً صدر، راشٹرپتی، راجا، بادشاہ، گورنر جنرل وغیرہ کو اس بات کا کوئی اختیار نہ ہوگا کہ ایسے مجرم کی سزا معاف کر دیں یا کم کر دیں، بلکہ یہ اختیار صرف ان لوگوں کو ہوگا جن پر حملہ اور ظلم کیا گیا ہو۔

بیجا نہ ہوگا کہ اس موقع پر یہ بھی بتا تا چلوں کہ ان جرائم کی اسلامی سزا کیا ہے؟ سزا یہ ہے کہ قاتل نے اگر جان بوجھ کر قتل کیا ہے تو اسے بھی قتل کر دیا جائے، اور اگر غلطی سے قتل کیا ہے تو اس پر بھاری مالی تاوان لگایا جائے، اور تاوان مقتول کے گھر والوں کو دیا جائے، اگر کسی نے کسی پر حملہ کیا ہے تو حملہ آور نے جیسی چوٹ لگائی ہے اسے بھی ویسی ہی چوٹ لگائی جائے یا چوٹ کی نوعیت کے لحاظ سے کڑا مالی تاوان لگایا جائے، کسی نے کسی کا مال چوری کیا ہے تو کچھ خاص شرطیں پوری ہونے کی صورت میں چور کا ہاتھ کاٹ لیا جائے، ورنہ جج اپنی صوابدید سے مناسب سزا دے، اور مال برآمد ہو جائے تو اسے اصل مالک کے حوالے کر دیا جائے، اسی طرح اگر کسی نے کسی کی عزت پر بٹہ لگایا ہے تو ملزم کی حالت کا اندازہ کر کے جج کوئی ایسی سزا دے کہ ملزم آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔

ہاں اگر کوئی شخص کسی بدمعاش یا ڈکیت سے اپنی جان یا مال یا آبرو کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے تو وہ مظلوم ہے، لیکن اگر وہ خود حملہ آور کو مار ڈالے تو ظالم نہیں ہے، لہٰذا اس سے بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ دونوں کے متعلق محمد ﷺ کے ایک ایک ارشاد سناتا ہوں۔ ایک بار آپ نے فرمایا:

''جو اپنی جان بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنا مال بچانے میں مارا جائے وہ شہید

ہے اور جو اپنی آبرو بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے‘‘ (بخاری، مسلم، مشکاۃ ص ۳۰۵)۔

اور ایک بار ایک آدمی نے آکر سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ بتائیے کہ اگر کوئی آدمی آکر میرا مال چھیننے لگے تو...؟ آپ نے فرمایا: اسے اپنا مال نہ دو، اس نے کہا: اگر وہ مجھ سے لڑائی کر بیٹھے تو؟ آپ نے فرمایا: تم بھی اس سے لڑ جاؤ، اس نے کہا: اگر وہ مجھے قتل کر دے تو؟ آپ نے فرمایا: تم شہید ہو گئے، اس نے کہا: اگر میں اسے قتل کر دوں تو؟ آپ نے فرمایا: وہ جہنم میں جائے گا۔ (صحیح مسلم، مشکاۃ ص ۳۰۵)۔

ان دونوں کا حاصل یہ ہے کہ اپنا بچاؤ کرنا ہر شخص کا حق ہے، اگر بچاؤ کرنے والا خود مارا گیا تو مظلوم ہے اور حملہ آور سے اس کا بدلہ لیا جائے گا، لیکن اگر حملہ آور مارا گیا تو وہ ظالم تھا اس لئے اس کا خون رائیگاں جائے گا اور بدلہ نہیں لیا جائے گا۔

یہاں اسلامی قانون کے ایک ایک ٹکڑے کی تفصیل بتانے گنجائش نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے دائرے میں کوئی بھی آدمی مظلوم مارا جائے تو اس کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ اگر کسی بھی طرح قاتل کا پتہ نہ چل سکا تو مقررہ مالی تاوان حکومت کے خزانے سے دیا جائے گا۔

ابتک کی گزارشات کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام تشدد شروع کرنے کی اجازت نہیں دیتا، لیکن جو تشدد کرے اسے آزاد بھی نہیں چھوڑتا اور نہ معمولی سزائیں دے کر اس کی ہمت کو بڑھاوا ملنے کا موقع دیتا ہے، بلکہ جیسا جرم ہے ٹھیک اسی کے مطابق سزا دیتا ہے، اور اسی طرح تشدد کی جڑ کاٹتا رہتا ہے۔ دراصل پوری انسانی تاریخ کا تجربہ ہے کہ انسانی سماج سے اس طرح کے جرائم کبھی بھی ایک دم ختم نہیں ہو جاتے، مجرم انسان ہمیشہ پائے گئے ہیں اور ہمیشہ پائے جائیں گے، اس لئے اس کا علاج صرف یہی ہے کہ سزا اتنی کڑی کر دی جائے کہ ایسے جرائم کم

سے کم ہو کر نہیں کے برابر رہ جائیں۔

کڑی سزا کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اور نرم سزا کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا پتہ مختلف ملکوں میں ہونے والے جرائم کے اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے، امریکہ اپنے آپ کو انسانی حقوق کا علمبردار و پاسبان اور تہذیب و تمدن کا لیڈر کہتا ہے، مگر وہاں کے جرائم کے متعلق سات سال پہلے کی رپورٹ یہ ہے:

امریکہ میں ہر ۴۳ منٹ میں ایک قتل، ہر ۱۹ منٹ میں ایک عورت کا جبری اغوا، ہر دو منٹ میں ایک چوری، ہر بیس سکنڈ میں گھر پر حملہ، ہر ۴۸ سکنڈ میں بس یا کار پر حملہ اور ہر بیس سکنڈ میں ایک ڈاکہ کا کیس پیش آتا ہے۔

یہ سات سال پہلے کی رپورٹ ہے، اب ان جرائم میں کچھ اور اضافہ ہوا ہے۔ اس کے برعکس سعودی عرب کو دیکھئے جہاں اسلامی سزائیں نافذ ہیں (جنھیں موجودہ علمبرداران تہذیب کڑی ہی نہیں بلکہ وحشیانہ بھی کہتے ہیں) ان سزاؤں کے نفاذ کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں سال کے سال گزر جاتے ہیں اور قتل اور چوری ڈاکہ وغیرہ کی شاید باید ہی کوئی واردات ہوتی ہے، اور وہ بھی عموماً باہری لوگوں کے ہاتھوں۔

آیئے ذرا اس معاملہ کا جائزہ اس پہلو سے بھی لیں کہ امریکہ کے دور اندیش شہری اپنے یہاں کی مذکورہ صورتحال کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟ اور ان کے نقطۂ نظر سے اس کا علاج کیا ہے؟ چند سال پہلے کی بات ہے کہ پاکستان میں کچھ اخلاقی مجرموں کو مجمع عام میں کوڑوں کی سزا دی گئی، اس پر نیویارک ٹائمز نے استہزاء اور تمسخر کا انداز اختیار کیا اور اس موضوع پر اپنے یہاں مراسلات کا ایک کالم کھول دیا، اس کالم میں شکاگو کی رہنے والی ایک امریکن خاتون ایلا شائر کا بھی ایک خط چھپا، وہ لکھتی ہیں:

''اسلام کے عدل وانصاف کے نام پر یہی میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی اس قسم کی سزا کو رائج کرنا چاہیۓ جو فوری اور سنگین طور پر مجرموں کی گوشمالی کر سکے، اگر ہمارے یہاں اس قسم کا نظام رائج ہوتو ہم بھی آبروریزی، لوٹ مار اور قتل وغارت گری کے خوف سے بے نیاز ہو کر کوچہ وبازار میں چل پھر سکیں اور ممکن ہے ہمارے جیل خانے مجرموں سے اتنا نہ بھریں جتنا آجکل بھرے ہوتے ہیں'' (سیاست جدید، کانپور ۱۲/ دسمبر ۱۹۷۹ء)۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ آجکل کا ہے، کویت کی ایک خاتون جسکا نام ام المثنیٰ ہے، کچھ دنوں امریکہ میں رہیں، ان کا ایک تازہ بیان کویت کے ایک مشہور ہفت روزہ رسالہ ''المجتمع'' نے ۱۷/ جولائی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں شائع کیا ہے، وہ لکھتی ہیں:

''امریکہ میں اپنے قیام کے دوران کچھ دنوں کے لئے میں ایک ہسپتال میں بھرتی ہوئی، وہاں ایک امریکن نرس سے میرا میل جول بڑھ گیا، چونکہ میں پابندی سے اسلامی چادر اوڑھتی تھی، اس لئے وہ مجھ سے بار بار میرے ملک اور میرے مذہب کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی، ایک دن اس نے مجھ سے اسلامی سزاؤں کے بارے میں پوچھا کہ یہ سزائیں کیا ہیں؟ میں نے کہا: قاتل کو قتل کر دیا جائے، چور کا ہاتھ کاٹ لیا جائے، حرام کاری کرنے والوں کو پتھر مار کر ختم کر دیا جائے یا کوڑے مارے جائیں... اور... یہ سن کر اس نے بڑی حیرت اور خوشی ظاہر کی، کہنے لگی میری آرزو ہے کہ میرے ملک میں بھی اسلامی شریعت لاگو کی جائے۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ کے ملک میں یہ سزائیں دی جاتی ہیں؟ میں نے کہا: نہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ بعض لوگ انہیں موجودہ زمانے کے لائق نہیں سمجھتے اور خلاف تہذیب مانتے ہیں۔

پھر میں نے اس سے کہا: مجھے تعجب ہے کہ تم اسلامی شریعت کو لاگو کرنے کے بارے میں

گرمجوش کیوں ہو؟ جبکہ خود میرے ملک کے بعض لوگ اس پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں؟ اس نے کہا: جو شخص اتنی بہترین سزاؤں کو نشانہ بناتا ہے وہ غلطی کرتا ہے، ہم لوگ اپنے ملک میں قتل، چوری ڈکیتی، اغوا وغیرہ کے روزمرہ بے انتہا جرائم کی وجہ سے امن وامان کی بربادی اور لاقانونیت کی کڑی سزا جھیل رہے ہیں، اوران جرائم کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ کافی ثبوت مہیا ہوجانے کے بعد بھی مجرموں کو کوئی ایسی کڑی سزا نہیں دی جاتی کہ وہ آئندہ جرم کرنے کی ہمت نہ کریں۔

اس کے بعد اس نرس نے بتایا کہ اس کا شوہر پولیس مین ہے، اوراس معاملہ کی وجہ سے سخت مشکل سے دوچار رہتا ہے، کیونکہ مجرم کو پکڑنے کے لئے پولیس یونٹ جس قدر محنت ومشقت کرتی ہے ان سب پر اس وقت پانی پھر جاتا ہے جب جج اس کو بے گناہ قرار دیدیتا ہے، یا معمولی سزا دیکر چھوڑ دیتا ہے، اس سے مجرموں کی ہمت اور بڑھ جاتی ہے اور وہ نئے سرے سے جرم کرکے شہریوں کا امن وامان تہ وبالا کرتے رہتے ہیں۔

یہ باتیں کہتے کہتے وہ نرس اداس ہوگئی اور رخصت ہونے سے پہلے بولی: تمہارے ملک کے جو لوگ ان سزاؤں کو لاگو کرنے کی مخالفت کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، انہیں چاہیے کہ ہمارے ملک کی جو درگت بن چکی ہے اس سے سبق سیکھیں اور اپنے ملک میں اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی ان سزاؤں کو لاگو کروادیں"۔

دور کیوں جائیے! اپنے ملک میں باغپت (ضلع میرٹھ) میں جو حادثہ پیش آیا تھا کہ پولیس نے ایک عورت کو ننگا کرکے گھمایا تھا اوراس پر سخت ہیجان پھیل گیا تھا۔ اس کے بعد اچھے اچھے ماہرین قانون نے یہ رائے دی تھی کہ عورتوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرنے والوں کو پھانسی کی سزا دی جائے، اوراس طرح کے کیس بند کمرے میں سنے جائیں، اورعورتوں سے

بیان لینے والی جج عورتیں ہوں۔

سسوابازار ضلع گورکھ پوراسی طرح دیوریااور بستی ضلع کے بعض بعض دیہاتوں میں پولیس نے جس بے دردی سے عورتوں کی آبرو لوٹی، بیلچھی اور دوسری جگہوں پر جس سنگدلی کے ساتھ ہریجنوں کواور جبل پور بھیونڈی وغیرہ میں مسلمانوں کوآگ کے اندر زندہ جلایا گیا، مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے ملک میں انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے مجرموں کوکڑی سزائیں دی جاتیں تو بڑے سے بڑا سورما بھی مجبوروں اور نہتوں پراس طرح کاظلم کرنے کی ہمت نہ کرتا، کڑی سزاؤں سے صرف بڑے بڑے جرائم ہی بند نہیں ہوتے بلکہ چھوٹے چھوٹے جرائم بھی ختم ہوجاتے ہیں، سعودی عرب میں جس کا ذکر پیچھے آچکا ہے، میں نے خود دیکھا ہے کہ دوکان کے نمونہ کا سامان رات بھر سڑک کے کنارے دوکان کے باہر لٹکتا رہتا ہے، مگر کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی، دوکان کھلی چھوڑ کر لوگ نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں مگر ایک معمولی سامان بھی غائب نہیں ہوتا، دنیا بھر کی کرنسیاں بدلنے والوں کی دوکان کے پھاٹکوں پر ہر طرف نوٹوں کی گڈیاں اس طرح لگی رہتی ہیں کہ ہمارے یہاں پان کی دوکان والے بھی اس سے زیادہ احتیاط سے رہتے ہیں، مگراس کے باوجود ایک نوٹ بھی غائب نہیں ہوتا، لوگ بینکوں سے لاکھوں لاکھ کے نوٹوں کی گڈیاں اس طرح مٹھی میں لیکر چلتے ہیں جیسے مولی ترکاری لے جارہے ہوں، مگر مجال نہیں کہ کوئی بری نیت سے تاک دے، عورتیں دن یا رات میں کسی بھی وقت کہیں بھی جارہی ہوں انہیں کوئی خطرہ نہیں۔

ہمارے سامنے پڑوس کے ملک پاکستان کی تازہ مثالیں موجود ہیں، جنرل ضیاء الحق نے جب پہلی بار اعلان کیا کہ اب پاکستان میں اسلامی سزا لاگو ہوگی، اور چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا، تو اس کے ایک مہینہ کے بعد قومی آواز لکھنؤ میں میں نے ایک چھوٹی سی خبر پڑھی کہ پہلے شہر کراچی

میں ہر رات ۲۷ چوریاں ہوتی تھیں، جن میں سے اکثر چوریاں بہت بڑی ہوا کرتی تھیں، مگر جنرل ضیاء کے مذکورہ اعلان کے بعد ۲۷ روز میں صرف ۷ چوریاں ہوئیں اور وہ بھی بہت معمولی قسم کی۔

اسی طرح جنرل ضیاء کی فوجی حکومت کے شروع دنوں کی بات ہے، تین بدمعاشوں نے مل کر سات آٹھ سال کے ایک بچے کو اغوا کیا، اور اس کے باپ کو فون پر نوٹس دی کہ فلاں دن فلاں جگہ (غالبًا) چالیس ہزار روپے پہنچادو، ورنہ بچے کو قتل کردیا جائے گا، بیٹا بیٹا ہی ہوتا ہے اس کے سامنے روپے پیسے دھن دولت کی کیا حیثیت؟ باپ نے روپے بھجوا دیئے، مگر کوئی لینے نہ آیا اور پھر بچے کی لاش پائی گئی۔ خفیہ پولیس مجرموں کی تلاش میں تھی ہی، آخر تینوں پکڑے گئے، عدالت سے پھانسی کا فیصلہ ہوا، اور تینوں کو لاہور کے ایک چوراہے پر پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا گیا اور لوگوں کے دیکھنے کے لئے دیر تک لٹکتا چھوڑ دیا گیا، اس کے بعد یہ حال ہوا کہ جیسے دوسرے بدمعاشوں کی ہمت ہی جواب دے گئی ہو۔

اس طرح کی مثالیں تو بہت سی ہیں، مگر ہم مثالوں کے بجائے نتائج کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں، نتائج یہ ہیں کہ کڑی سزا دیجئے تو جرائم گھٹ کر نہیں کے برابر رہ جاتے ہیں، اور نرم سزا دیجئے تو لاکھوں اور کروڑوں تک جا پہنچتے ہیں۔ امریکہ میں جرائم کے جو اعداد و شمار بتائے گئے ذرا ان کا سالانہ حساب جوڑیئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں سال بھر میں ۱۲۲۲۳[1] آدمی مارے جاتے ہیں، ۲۷۳۹۸ عورتیں زبردستی اٹھا لے جائی جاتی ہیں، ۶،۶۲۸،۰۰ چوریاں ہوتی ہیں، ۱۵۷۶۸۰۰ ڈاکے پڑتے ہیں اور گھروں، کاروں بسوں پر ۲۳۶۵۲۰۰ حملے ہوتے ہیں۔ یعنی مجموعی طور پر سال بھر میں ۴۶۴۴۴۲۱ حادثے ہوتے ہیں، اور یہ کھلی بات ہے کہ اسی حساب

(۱) ایک دو سال پہلے کی رپورٹ میں سالانہ قتل کی واردات ایک لاکھ بتائی گئی ہے۔

سے خونی، ڈاکو، چور اور مجرم بھی تیار ہوتے ہیں۔

اب سوچیئے کہ تشدد کو روکنے اور پبلک کو سکھ چین پہنچانے کے لئے یہ نظام اچھا ہے یا سعودی عرب جیسا وہ نظام جس کے نتیجہ میں قاتل مقتول دونوں کو ملا کر مشکل سے دو چار جانیں جاتی ہیں؟ اور مشکل سے چوری وغیرہ کے دس پانچ حادثے ہوتے ہیں؟ اور خونی، ڈکیت، چور وغیرہ تیار ہی نہیں ہونے پاتے، بلکہ فوراً ہی ان کی جڑ کٹ جاتی ہے، اگر دنیا کو تشدد سے بچنا ہے تو اس پہلو پر کھلے دل سے سوچنا ہوگا۔

ابتک ہم نے جو گفتگو کی ہے اس میں تشدد کے اسباب پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، چونکہ انسان پر مذہب اور عقیدہ کی گرفت سب سے مضبوط ہوتی ہے' اس لئے بے جا نہ ہوگا کہ ہم تشدد کے چند موٹے موٹے اسباب کی نشاندہی کر کے ان کے بارے میں اسلام کے موقف کی تعیین و توضیح کریں۔

انسانی تاریخ کا جائزہ لیجئے تو اندازہ ہوگا کہ تشدد کے اسباب مذہبی بھی ہیں، سماجی بھی اور اقتصادی بھی۔

مذہبی اسباب میں تشدد یا ہنسا کی ایک خاص وجہ مورتی پوجا ہے، ہندوستان، یونان، مصر اور عراق جو مورتی پوجا کے خاص خاص گڈھ رہ چکے ہیں، اور ہمارا ملک اب بھی ہے، ان کے بارے میں تاریخ نے دو باتیں خاص طور سے نوٹ کی ہیں، ایک یہ کہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی ایسی دیوی مانی گئی ہے جس کے متعلق عقیدہ تھا کہ اس کی مورتی پر انسان کا بلدان کیا جائے تو وہ بہت خوش ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں ہر جگہ انسانوں کو مورتیوں کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ ہمارے ملک میں جب اس طرح کی بھینٹ چڑھانے کا رواج حد سے بڑھ گیا تو مہاویر در مان اور گوتم بدھ نے اپنے اپنے وقت میں اس کے خلاف آواز اٹھائی، اور چونکہ یہ مذہبی پیشواؤں کے

ہاتھوں تشدد کے شکار عوام کے دل کی آواز تھی اس لئے بہت کامیاب رہی، ہندوستان میں نہایت تیز رفتاری سے بدھ مذہب کے پھیلنے کیوجہ یہی تھی کہ لوگ بھینٹ چڑھانے کی ان مسلسل کارروائیوں سے تنگ آچکے تھے۔اب بھی کبھی کبھی اخباروں میں خبر آتی ہے کہ کسی نے فلاں دیوی کو خوش کر کے دھن دولت حاصل کرنے کے لئے کسی لڑکے کو پکڑ کر بھینٹ چڑھادیا، یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ مجرم آدمی جب یہ سوچتا ہے کہ دیوی دیوتا ہم سے خوش ہو کر ہمارا کام بنادیں گے تو وہ کچھ زیادہ ہی ڈھیٹ اور مجرم ہو جاتا ہے۔

مورتی پوجا والے ملکوں کے بارے میں تاریخ نے دوسری بات یہ نوٹ کی ہے کہ وہاں کے مندر اور پوجا خانوں میں پجاریوں کے علاوہ دیوداسیاں بھی رہتی تھیں۔ عام طور پر ان دیوداسیوں سے پجاریوں کا ناجائز تعلق ہوتا تھا، جس نتیجہ میں ناجائز بچے پیدا ہوتے تھے، اور سماجی عار سے بچنے کے لئے ان بچوں کا گلا گھونٹ کر ماردیا جاتا تھا، بلکہ بہت سے حالات میں خود بچہ جننے والی دیوداسیوں کو بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا، پھر اسی طرح کی ہوس رانی اور حرام کاری کے عادی پجاریوں کا جذبۂ ہوس کچھ اور ترقی کرتا تو وہ زیارت اور عبادت کی غرض سے آنے والی عورتوں کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے، اور اگر عورت کسی ایسے خاندان سے ہوتی جس سے انتقام کا اندیشہ ہوتا تو اسے حرام کاری کے بعد قتل بھی کر دیتے تھے۔اور اس مقصد کے لئے خفیہ قتل گاہیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ ہمارے شہر بنارس کی گیان واپی مسجد سے متصل مندر کے سلسلہ میں اس طرح کے واقعات تاریخ بنارس کا ایک مشہور باب ہیں، اور اسی طرح کے ایسے کے نتیجہ میں اس مسجد کو ان قتل گاہوں کے کھنڈر پر خود ایک ماتحت ہندو حکمراں نے تعمیر کروایا تھا۔

یورپ میں عیسائی گرجوں کے اندر ننوں کے رکھنے کا رواج نکلا تو اس کا بھی یہی حشر ہوا، جو مندروں میں دیوداسیوں کو رکھنے کا ہوا تھا۔

اسلام نے اس طرح کے اسباب کی سرے سے جڑ ہی کاٹ دی ہے، اس کی تعلیم یہ ہے کہ پوجا صرف اللہ کی کی جائے، کیونکہ اللہ کے سوا جو کچھ ہے محض نان ہے، کسی کے پاس کچھ طاقت اور اختیار نہیں۔ ان کے پوجنے سے مرنے کے بعد والی دنیا تو برباد ہوتی ہی ہے، اس دنیا میں بھی جو کچھ ان کے لئے خرچ کیا جاتا ہے سب برباد جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اسلام میں یہ تصور ہی نہیں کہ کوئی آدمی سادھوؤں کی طرح پجاری بن کر مستقل طور پر عبادت خانوں میں رہے، اور وہاں عبادت کے لئے جانے والے اسی کے واسطہ سے عبادت کر سکیں، نیز عورتوں کو صرف نماز باجماعت میں شرکت کی اجازت ہے، اور یہ ایسا موقع ہوتا ہے جب کوئی خطرہ اور اندیشہ نہیں۔

ہنسا (تشدد) کی ایک بڑی وجہ مذہبی عصبیت اور جوش وجنون ہے، جب ایک مذہب کا ماننے والا دوسرے مذہب کے لوگوں کو زبردستی اپنے مذہب میں لانا چاہتا ہے تو ہنسا اور تشدد کی وارادات ہوتی ہیں، ہمارے ملک میں جب آرین قوم آئی تو اس نے مذہبی اور نسلی اونچ کے غرور میں یہاں کے اصلی باشندوں کو اتنی بڑی تعداد میں قتل کیا، لوٹا، مارا اور زندہ جلا دیا کہ انہیں دکھنی ہندوستان کے جنگلوں میں پناہ لینی پڑی، اور وہ ادھر ہی کے ہو کر رہ گئے، گوتم بدھ کی کوششوں سے جب بدھ مت نے عروج پکڑا تو ویدک دھرم کے آریوں کی مجنونانہ کارروائیاں رک گئیں، مگر جب بدھسٹوں کی حکومت کمزور ہوئی تو ویدک دھرم نے کھتری قوم کی جگہ تھوڑا سا روپ بدل کر راجپوت قوم تیار کی، اور بدھسٹوں کے خلاف قتل، غارت گری اور لوٹ پھونک کا ایسا بازار گرم کیا کہ انہیں ہمالیہ کے اس پار بھاگنا پڑا۔ آج چین، جاپان، برما وغیرہ ملکوں میں بدھ مت کی اکثریت ہے، ... لیکن یہ ہندوستان میں صرف نام کے لئے رہ گیا ہے، ان لڑائیوں میں مارے جانے والوں کا اندازہ کروڑوں تک کیا گیا ہے، یہ مذہبی جنون تھا، اور اس کے پیچھے

مذہبی تعلیم کام کر رہی تھی، ستیارتھ پرکاش سمولاس ۳ ص ۵۹ میں لکھا ہے:

”جو شخص وید اور وید کے مطابق بنائی ہوئی کتابوں کی بے عزتی کرتا ہے اس وید کی برائی کرنے والے منکر کو ذات، جماعت اور ملک سے باہر نکال دینا چاہئے“۔

اور خود یجر وید ا/ ۲۸ میں لکھا ہے: ”اے جاہ وجلال والے راج پوش! آپ دھرم کے مخالفوں کو آگ میں جلا ڈالیں، وہ ہمارے دشمنوں کو حوصلہ دیتا ہے، آپ اسے الٹا لٹکا کر خشک لکڑی کی طرح جلا ڈالیں“۔

اس طرح کی تعلیم سے جو مذہبی جنون پیدا ہوگا وہ ظاہر ہے، اور اس کا جو نتیجہ ہوگا اس کی طرح ہم ابھی اشارہ کر چکے ہیں۔

اسی طرح کا جنون دور وسطیٰ کے عیسائیوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ لبنان اور فلسطین پر ان کا قبضہ ہوا تو انھوں نے نہتے مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو اتنی بڑی تعداد میں قتل کیا کہ سڑکوں اور گلیوں میں گھٹنوں نے اوپر تک خون بہہ رہا تھا۔ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی تو وہاں کے کروڑوں مسلمانوں کا مارا اور زندہ جلا دیا گیا۔ مسلمان تو خیر عیسائیوں سے الگ ایک دوسرے دین و مذہب کے لوگ تھے، مگر عیسائی عدالت نے خود اپنے ملک کے عیسائیوں کو معمولی سے مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک کروڑ بیس لاکھ کی تعداد میں ہلاک کیا، اکیلے اسپین میں تین لاکھ چالیس ہزار عیسائیوں کو قتل کیا گیا، جن میں سے ۳۲ ہزار زندہ جلائے گئے تھے۔

یہ مذہبی جنون کے نتیجہ میں ہونے والے ہنسا اور تشدد کی چند مثالیں ہیں، اسلام نے مسلمانوں کے اندر سے اس کی بھی جڑ کاٹ دی ہے۔ اسلام کا اعلان ہے کہ ﴿لا إكراه في الدين﴾ دین میں زبردستی نہیں، یعنی جو شخص اپنی مرضی سے جس دین اور مذہب میں چاہے

رہے، اسے زبردستی دین اسلام میں داخل نہ کیا جائے گا، بلکہ اسلام نے یہ بھی بتادیا ہے کہ اگر کوئی شخص زبردستی محض اسلام کا کلمہ پڑھ لے اور دل سے مسلمان نہ ہوتو وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں، اس لئے کسی کو زبردستی مسلمان بنانا سرے سے بے کار ہے، ظاہر ہے اس وسعت قلبی اور رواداری کے بعد مذہبی عصبیت اور جبر ودباؤ کا نہ کوئی وجود رہے گا، نہ اس کی وجہ سے انفرادی یا اجتماعی تشدد پھوٹے گا، بشرطیکہ دوسرے دین دھرم کے ماننے والے بھی اسی اصول کو اپنالیں۔

مذہبی عصبیت کی اسی راہ سے ہنسا (تشدد) کی ایک اور وجہ بھی جنم لیتی ہے، یعنی دوسرے مذہب کی توہین اور بے عزتی، اسلام نے اس سے سختی کے ساتھ روکا ہے، قرآن میں حکم ہے:

﴿ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم﴾ (الانعام:۱۰۸)۔

اللہ کو چھوڑ کر دوسری جن چیزوں کی لوگ پوجا کرتے ہیں، ان چیزوں کو برا بھلا مت کہو، ورنہ وہ لوگ نادانی سے اللہ ہی کو برا بھلا کہیں گے۔

اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان نہ دوسروں کے مذہب کی توہین کرتے ہیں، نہ ان کے پیشواؤں اور پرکھوں کی، اور نہ ان کے مندروں اور عبادت خانوں کی۔ آپ ہندوستان پر مسلمانوں کی گیارہ سو سالہ تاریخ دیکھ ڈالئے! انہیں اتنی قوت حاصل تھی کہ وہ یہاں جو کچھ چاہتے کر ڈالتے، مگر نہ انھوں نے مندر توڑے نہ بت، نہ دوسرے دھرم کے پرکھوں کو برا بھلا کہا، نہ ان کے ماننے والوں کو زبردستی مسلمان بنایا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی مسلمانوں کی تعداد سرکاری اعداد وشمار کے مطابق صرف گیارہ بارہ فیصد ہے۔ پنجاب محمود غزنوی کے زمانے میں فتح ہوا تھا، اور بنگال مغلوں سے پہلے، لیکن ان دونوں علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت

اس وقت ہوئی جب مسلمانوں کے بجائے بنگال پر انگریزوں کی اور پنجاب پر سکھوں اور پھر انگریزوں کی حکومت تھی۔ آپ یہ بھی دیکھ لیجئے کہ تین ساڑھے تین سو برس تک سکھ اور مسلمان ایک دوسرے سے اکثر لڑتے رہے، مگر مسلمانوں نے نہ کبھی گرنتھ صاحب کو جلایا، نہ گرونانک کی مورتی توڑی، نہ ان کے کسی گردوارے میں قدم رکھا۔ گولڈن ٹیمپل کی بات تو بہت دور کی رہی، اس کی وجہ یہی تھی کہ مسلمان اگرچہ اپنے مذہب سے بہت دور جا پڑے تھے تاہم ان پر ان کے دین کی اس تعلیم کا کچھ نہ کچھ اثر باقی تھا کہ دوسرے مذہب کی مقدس کتابوں، عبادت خانوں اور بزرگوں کی توہین کر کے اس مذہب والوں کی دل آزاری نہیں کرنی چاہئے۔

مگر آپ ۴۷ء کے بعد کا حال دیکھئے! ابھی ۳۷ برس بھی پورے نہیں ہو سکے کہ گولڈن ٹیمپل ڈھ گیا، حالانکہ اس کی سپلائی کاٹ کر سارے لڑنے والوں کو زندہ گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ سیکڑوں گردوارے روندے گئے، اور مسلمانوں کے ساتھ جو اندھیر نگری مچی ہے اس کا تو کہنا ہی کیا ہے، ملک آزاد ہوتے ہی مسلمانوں پر جو حملہ ہوا اس کے نامکمل اعداد و شمار یہ تھے کہ ہندوستانی علاقے میں دس لاکھ ساٹھ ہزار مسلمان مارے گئے، اور اس کے بعد سے آج تک خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے اسے کہاں تک گنائیں، تنہا نیلی میں سرکاری اعداد و شمار تین ہزار اور غیر سرکاری دس سے تیرہ ہزار ہے۔ جبل پور، راوڈ کیلا، تھانہ، احمد آباد، جمشید پور، بھیونڈی، بمبئی وغیرہ وغیرہ ہزاروں فسادات کے اعداد و شمار الگ الگ ہیں۔ پھر بربریت کا عالم یہ کہ سرکاری فورس تک کے بارے میں سنا گیا کہ انھوں نے زندہ انسانوں کی آنکھ نکال لی اور ہاتھ پاؤں کاٹ کر زندہ لٹکا دیا، کسی کا بھاری پتھر سے گھٹنا اور کہنہ توڑ کر زندہ چھوڑ دیا گیا، عورتوں کی بے حرمتی کر کے ان کی شرمگاہوں پر تیزاب ڈال دیا گیا، قرآن کی الگ بے حرمتی کی گئی۔

مسجدوں کا یہ حال ہوا کہ ۴۷ء میں ساڑھے تین سو سے اوپر مسجدیں صرف دہلی میں ڈھادی

گئیں، یا انہیں رہائشی مکان میں تبدیل کرلیا گیا، دہلی کی ۹۰ سے اوپر مسجدوں میں آج تک تالا پڑا ہوا ہے، جن میں سے شاید دو چار مسجدیں آجکل امام عبداللہ بخاری کے سخت پروٹسٹ کے بعد کھول دی گئی ہیں۔

مراد آباد کی عیدگاہ میں جو طوفان قیامت اٹھا اور چھوٹے بچوں تک کو جس طرح بھون دیا گیا وہ سب کو معلوم ہے، ہمارے مورخین (اتیہاس لیکھکوں) نے مسلمانوں کے گیارہ سو سالہ دور حکومت کے متعلق جتنے افسانے گھڑ ڈالے ہیں اگران سب کو اکٹھا کرلو اور صحیح مان لو تب بھی وہ کل کے کل مل کر اس چھتیس سینتیس برس میں ہونے والے ظلم اور اتیاچار کا سواں کیا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک دوسرے مذہب کے بڑوں اور پرکھوں کی عزت اور قدر کا سوال ہے تو ذرا بازار میں نکلو، دوکانوں پر بکنے والی کتابوں کو دیکھو، بلکہ اتیہاس کے نام پر سرکاری کورس کے اندر جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اور ابھی تازہ بہ تازہ چھپ کر آیا ہے اسی کو دیکھ لو۔ وہ محمد ﷺ جنھوں نے انسانیت کو ظلم وقہر اور گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر رشد وہدایت اور انسانیت کی روشنی میں پہنچایا، اور جن کے متعلق ان کے دشمنوں نے بھی مانا ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں اتنا بڑا انسان پیدا نہیں ہوا، ان کے متعلق دیکھو کہ یہاں کے لکھنے والے کیا لکھتے ہیں، کتنی بری زبان ہے، کیسا دلآزار بیان ہے اور کیسی جھوٹ کی بھرمار ہے۔ میں مسلمان ہوں لیکن سچ کہتا ہوں کہ میرے نہیں بلکہ دوسرے دھرم کے پیشوا کے بارے میں ایسی باتیں لکھی جائیں تو میں انہیں اپنی زبان پر لانے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ گاندھی جی کی روح یقیناً کھڑی فریاد کررہی ہوگی - اگر وہ کھڑی ہوسکتی ہوگی - کہ کیا یہ اندھیر نگری ہے جو گاندھی بھکتوں کے ہاتھوں ان کے دیش میں ہو رہی ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ مذہبی عصبیت وجنون اور دیوانگی کا اثر ہے، اور کسی کی روح فریاد

کر کے اس کو ختم نہیں کر سکتی، جبتک کہ اس کا صحیح علاج نہ ہو، جب تک ہنسا کرنے والوں کے
ہاتھ نہ پکڑے جائیں، اور نہتے مردوں، عورتوں، بوڑھوں، بچوں پر گولیاں چلانے والے
سورماؤں کو تمغے دینے کے بجائے ان کا احتساب نہ کیا جائے۔ موٹی سی مثال سامنے ہے،
یہاں ہر سال آدھے ہزار کے قریب چھوٹے بڑے فساد ہوتے ہیں، پاکستان میں اس کا کہیں
نام ونشان نہیں، آخر کیوں؟ اس کی وجہ کھوج کر اس کو اپنایئے، اگر گاندھی بھگتی سے علاج نہیں
ہوتا تو جناح بھگتی سے کیجئے، بیمار کو دوا چاہئے، ڈاکٹر کون ہے؟ اسے اس کے کیا مطلب؟

ہوسکتا ہے کہ اس مرحلہ پر ہمارے کچھ بھائی سومنات اور کچھ اور مندروں کا حوالہ دیں، اس
بارے میں صحیح تاریخی حقیقت سمجھنے کے لئے ایک سوال پر غور کرنا ضروری ہے۔ محمود غزنوی کی
فوجیں بنارس کے قریب تک آئیں، دریائے سندھ سے یہاں تک سیکڑوں مندر اور ہزاروں
بت رہے ہوں گے، خود سومناتھ مندر کا حال یہ تھا کہ دو ہزار برہمن اس مندر کے پجاری تھے،
اور بڑے بڑے ہندو سرداروں کی پانچ سو جوان بیٹیاں اس مندر کے اندر رہتی تھیں، لہٰذا لازما
اس مندر میں بھی بڑے بت کے علاوہ سیکڑوں اور بت تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ محمود غزنوی کی
فوجوں نے تھانیسر، متھرا اور سومنات کو چھوڑ کر باقی پورے ہندوستان میں کہیں بھی نہ کسی مندر
کو ہاتھ لگایا، نہ کسی بت کو توڑا؟ یہاں تک ان تینوں جگہ بھی کوئی بڑی توڑ پھوڑ نہیں مچائی، بلکہ
صرف ایک دو بتوں کو توڑا، پھر سومنات میں تو لاکھوں کروڑوں کا دھن دولت بھی بت بچانے
کے لئے پیش کیا گیا، لیکن غزنوی نے ان سب کو ٹھکرا کر بت ہی کو توڑا، کھلی بات ہے کہ اگر محمود
غزنوی کو بت توڑنے سے دلچسپی ہوتی تو وہ ہر جگہ کے سارے بت توڑ جاتا، اور اگر دھن دولت
سے دلچسپی ہوتی تو اسے اتنی دولت دی جا رہی تھی کہ بت توڑنے میں اس کا پاسنگ بھی ملنے کی
امید نہ تھی، بس اتنی سی بات پر آپ غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بت نہ دولت کے لالچ

میں توڑا گیا تھا، نہ مذہبی دشمنی کی بنا پر، بلکہ اس کی تہ میں گولڈن ٹیمپل کی طرح کا کوئی اور معاملہ کارفرما تھا۔

اس کی مختصر روداد یہ ہے کہ محمود غزنوی کے جو بارہ یا سترہ حملے مشہور ہیں، ان میں سے ابتدائی کئی لڑائیاں ہندوستان کی اس وقت کے سرحد کے اس پار سیکڑوں میل دور غزنی اور ملغان کے علاقوں میں ہوئیں، یعنی یہ حملے غزنوی حکمرانوں نے نہیں کئے، بلکہ ہندوستان نے کئے اور وہ بھی اس طرح کہ غزنوی حکمرانوں کو ترکستان و خراسان میں الجھا ہوا پا کر سارے ہندوستان کی بے شمار فوجوں نے مہاراجہ پنجاب کی متحدہ کمان میں بے روک ٹوک پیش قدمی کر کے راجدھانی غزنی تک کو خطرے میں ڈال دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کے ہر حملہ میں ہندوستان کا ٹڈی دل لشکر غزنی کی مٹھی بھر فوج کے مقابل بری طرح شکست کھا گیا، چونکہ ہر حملہ راجہ پنجاب کی قیادت میں ہوتا تھا، اس لئے راجہ پنجاب نے ہر بار شکست کے بعد غزنوی حکمرانوں سے معافی مانگی، اور اسے ہر بار معاف کر دیا گیا، مگر اس نے ہر بار غداری اور بدعہدی کی، اس طرح جب سلطنت غزنی پر چار حملے ہو چکے اور چار بار معافی مانگ کر غداری و بدعہدی کی جا چکی، تب محمود غزنوی نے پنجاب پر جوابی حملہ کیا اور اسے اپنی سلطنت میں شامل کیا۔

اس عرصہ میں باوجودیکہ محمود غزنوی نے راجہ پنجاب کو بے حد رعایتیں دے رکھیں، اور اس کی نہایت ہی خوفناک سازشوں اور بدترین غداریوں اور بدعہدیوں کو معاف کرتا رہا، مگر اس شریفانہ برتاؤ کا جواب ہندوستانی راجاؤں کے پاس یہ تھا کہ ان ''ملیچھوں'' (مسلمانوں) کو نیست و نابود کر ڈالو، یہ مذہبی جنون تھا، جسے اسلام دشمنی نے دوآتشہ کر دیا تھا۔ اسی جوش جنون میں بدھ مت اور ویدک دھرم نے باہمی عداوت بھلا کر کاندھے سے کاندھا ملا لیا، اور ایک

مشترکہ اور دونوں کے لئے قابل قبول دھرم کی حیثیت سے ویشنو دھرم کی ایجاد عمل میں آئی اور اسی اسلام دشمنی کے جنون میں ہندوستانی راجاؤں اور برہمن پیشواؤں نے مسلمانوں کے بدترین دشمن قرامطہ سے ساز باز کی، اور حضرت علی کو دسواں اوتار مان کر قرامطہ کو بھی ہندو جاتی میں شامل کرلیا، اوران کے ذریعہ محمود غزنوی کے خاتمہ کی سازش میں بحرین کے قرامطہ اور مصر کے عبیدیوں تک سے سانٹھ گانٹھ کی۔ اس سازش کا سب سے پہلا گڑھ تھانیسر تھا، پھر متھرا مہابن اور سومنات، اور چونکہ اس کی لگام برہمن پیشواؤں کے ہاتھ میں تھی، اس لئے یہ کام مذہبی دربار یعنی مندر میں انجام پاتا تھا۔ ان مندروں کے بڑے بتوں کے متعلق عوام کو یہ بھی یقین دلا رکھا گیا تھا کہ یہ محمود غزنوی کو نسٹ کر ڈالیں گے، اور یہی یقین دہانی عوامی جوش خروش کا سبب تھی، اور یہ جوش خروش اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ مالدار تو مالدار غریب اور بیوہ عورتیں تک چرخے کات کات کر اور اپنے زیور بیچ بیچ کر فوجوں کی تیاری میں مدد دے رہی تھیں۔

بار بار کے تجربے کے بعد محمود غزنوی اس کا انتظار نہیں کرسکتا کہ اس کی سلطنت پر پھر حملہ ہو، چنانچہ مجبوراً اس نے پیش قدمی کر کے پہلے تھانیسر کا سازشی گڑھ ختم کیا، پھر متھرا اور مہابن کا، یہاں کے بتوں کو توڑنا اس لئے ضروری تھا کہ جب تک وہ باقی رہتے ہندوؤں کا یہ یقین برقرار رہتا کہ محمود غزنوی نسٹ ہوجائے گا، اور اس کی وجہ سے ایک نہ ختم ہونے والی جنگ اور بے پناہ قتل وخونریزی کا سلسلہ جاری رہتا، اس کے برعکس بت توڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان علاقوں سے جنگ کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

تھانیسر اور یوپی کے ان دو تین بتوں کے ٹوٹنے کے بعد عام ہندوؤں کا جنگی جنون تو سرد ہو چلا تھا، لیکن ابھی سازشی گروہ کے دم خم باقی تھے، چنانچہ ایک مرتبہ پھر جنگی جوش خروش پیدا کرنے اور غزنی کی سلطنت کے خلاف قتل و غارت گری کی متحدہ آگ بھڑکانے کے لئے

برہموں نے تمام ملک میں اس بات کو شہرت دیدی کی سومنات کا بت تھانیسر اور متھرا کے بتوں سے ناراض تھا، لہٰذا اس نے موقع دیا کہ محمود ان بتوں کو توڑ دے، اور اسی لئے سومنات نے محمود کی مخالفت میں کوئی کام نہیں کیا، لیکن اب سومنات ایک چشم زدن میں محمود کا کام تمام کر دے گا، کیونکہ وہ تمام بتوں کا بادشاہ ہے، اور سمندر اس کی عبادت کے لئے مقررہ اوقات میں حاضر ہوتا ہے، چونکہ جوار بھاٹا کی وجہ سے سمندر کا پانی کبھی مندر سے میلوں پرے ہوتا اور کبھی مندر تک آ جاتا، اس لئے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنایا جاتا کہ دیکھو یہ سمندر بت کی عبادت کرنے آیا ہے۔

بہر حال یہ کوشش اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی کہ ایک بار پھر غزنی کے خلاف جنگ کا جوش بھڑک اٹھا، جس کا عالم یہ تھا کہ ہر روز ہردوار سے گنگا کا پانی سومنات پہنچتا تھا، اور اس کے ساتھ ہی سومنات میں ایک زبردست فوجی طاقت بھی جمع ہو گئی تھی، بالآخر محمود غزنوی کو اس نئے خطرے کی طرف متوجہ ہونا پڑا، اور اس نے سومنات فتح کر کے خاص اس بت کو توڑ دیا جس کے ہاتھوں محمود غزنوی کے نسٹ ہو جانے کی امید میں لاکھوں جانیں داؤں پر لگی ہوئی تھیں، اس تفصیل سے یہ حقیقت سمجھی جا سکتی ہے کہ ہزاروں بتوں اور مندروں کے ہجوم میں سے محمود غزنوی نے جو دو تین بت توڑے تو اسکی یہ کارروائی مذہبی نہیں تھی، بلکہ گولڈن ٹیمپل کے واقعہ سے بھی زیادہ سیاسی قسم کی تھی۔

محمود غزنوی سے متعلق یہ تفصیل محض بر سبیل تذکرہ آ گئی ہے، مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ اسلام مذہبی رواداری کا قائل ہے، نہ وہ دوسرے مذہب کے بڑوں کی توہین کرتا ہے نہ ان کے مذہبی کاموں میں رخنے ڈالتا ہے، نہ ان کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرتا ہے، نہ کسی کو جبراً مسلمان بنانے کی اجازت دیتا ہے، اور وہ دوسروں سے بھی یہی رواداری چاہتا ہے، اسی لئے

اسے یہ گوارانہیں کہ کوئی طاقت اپنی طاقت کے زعم میں مسلمانوں کواسلام کی تبلیغ سے روکے یا انہیں زبردستی غیر مسلم بنائے، یا جو اپنی آزاد مرضی سے مسلمان ہونا چاہے اسے مسلمان نہ ہونے دے، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی اپنے اندراتنی سی رواداری پیدا کرلیں تو مذہب کی وجہ سے کسی طرح کی ہنسااور تشدد نہیں ہوسکے گا۔

اب تک ہم نے ہنسا کے چند بڑے بڑے مذہبی اسباب بیان کئے تھے، آیئے! اب ایک دو سماجی وجہیں بھی سنتے چلیں جس سے خاص ہمارے ملک کو سامنا ہے، ہنسا کی ایک خاص وجہ ذات پات کا بھید بھاؤ اور اونچ نیچ ہے۔ چنانچہ ہمارے مالک کا سماج جو چھوٹی بڑی اور اونچی نیچی ذات برادریوں میں بٹا ہوا ہے، اس کی وجہ سے یہاں آئے دن چھوٹی ذات والوں کے مارے پیٹے جانے، قتل کئے جانے اور زندہ جلائے جانے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اور غالباً اس سے متاثر ہوکر چند سال پہلے الٰہ آباد کی انٹرنیشنل ہندو کانفرنس میں اپیل کی گئی تھی کہ ذات برادریوں کی اونچ نیچ اور باہمی چھوت چھات ختم کردی جائے۔ مگر چونکہ سماجی طبقات کی یہ تقسیم مذہبی (دھارمک) ہے اسلئے اس کا مٹانا سخت مشکل ہے، اس کے لئے یا تو آدمی اپنا مذہب چھوڑ دے یا پھر مذہبی رہنما اپنے مذہب میں تبدیلی لانے کا اعلان کریں، مگر یہ اعلان درحقیقت اس بات کا اعلان ہوگا کہ یہ خدائی مذہب نہ تھا، بلکہ انسانوں کے اپنے تیار کردہ کچھ اصول وضابطے تھے جنھیں مذہب کا تقدس دیکر نافذ کردیا گیا تھا۔

اسلامی تعلیمات کو دیکھئے تو وہاں اس اونچ نیچ کا نام ونشان تک نہیں، بلکہ مختلف سماجوں نے جو نیچ اونچ پیدا کردی تھی، اسلام نے اسے برائی قرار دیتے ہوئے مٹایا، اور مٹانے کی ترغیب دی۔ اس باب میں اسلام کی تعلیم قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

﴿یا أیها الناس إنا خلقناکم من ذکر وأنثیٰ وجعلناکم شعوباً وقبائل

لتعارفوا إن أكرمكم عند الله أتقاكم﴾ (الحجرات:۱۳)۔

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہیں قبیلے اور گروہ بنایا تا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو (ورنہ) تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے نیک ہو۔

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" یا أیها الناس ألا إن ربكم واحد وإن أباكم واحد، ألا لا فضل لعربي على عجمي، ولا لعجمي على عربي، ولا لأحمر على أسود ولا لأسود على أحمر إلا بالتقوى" (مسند احمد:۵/۴۱۱)۔

لوگو یاد رکھو! تمہارا رب بھی ایک ہے، اور تمہارے باپ بھی ایک ہی ہیں، یاد رکھو کہ نہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے، نہ عجمی کو عربی پر، نہ گورے کو کالے پر، اور نہ کالے کو گورے پر مگر صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔

اس طرح کی ہدایات بہت ہیں، اور مختلف پیرائے میں ہیں مگر سب کو نقل کرنا مقصود نہیں، کہنا یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم اونچ نیچ کے خلاف ہے، اور اس اسلامی تعلیم کا اثر یہ ہے کہ آج اتری ہندوستان اور اکا دکا جگہوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں مسلمانوں کے اندر اونچ نیچ کا کوئی تصور نہیں، اور یہاں بھی اس کا جو تصور ہے وہ محض اونچ نیچ ماننے والوں کے پڑوس میں رہنے کی وجہ سے ہے، اور وہ بھی صرف اتنا ہے کہ لوگ شادی بیاہ میں تھوڑی سی کنی کترا جاتے ہیں، ورنی ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے، کھانے، پینے، کھیلنے کودنے، کاروبار کرنے، پڑھنے پڑھانے، اور عبادت کرنے وغیرہ وغیرہ میں نہ کوئی تکلف ہے، نی ان معاملات میں اونچ نیچ یا چھوت چھات کا کوئی تصور ہے۔ اور اسی لئے مسلمانوں میں آپ کو اونچ نیچ کی لڑائی بھی نظر نہیں آئے

گی، جب کہ اسی ملک میں دوسرے لوگوں کی ذات برادریوں کا جھگڑا اتنا سخت ہے کہ اس کی وجہ سے پورے پورے گاؤں پھونک ڈالے گئے ہیں، اور زندہ انسانوں اور جانوروں تک کو جلا دیا گیا ہے۔

ہمارے یہاں تشدد (ہنسا) کا ایک اور سماجی سبب تلک یعنی جہیز کا لین دین ہے اس کی وجہ سے ایک طرف غریب گھرانوں کی لڑکیوں کی شادی میں جو غیر معمولی دیر ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی آوارگی، اور اخلاقی بے راہ روی ہے، تو دوسری طرف اس تلک کی وجہ سے تشدد کے واقعات بھی بکثرت ہوتے ہیں۔ جب داماد کو اس کی منشا کے مطابق جہیز نہیں ملتا تو وہ اور اس کے کنبے کے لوگ لڑکی کو ستانے کا سلسلہ شروع کرتے ہیں، جس سے تنگ آ کر لڑکی کبھی تو خودکشی کر لیتی ہے، اور کبھی سسرال والے اسے جان سے مار ڈالتے ہیں۔ اور حد یہ ہے کہ اس معاملے میں زندہ جلنے یا جلانے کی وارداتیں بھی بڑی کثرت سے ہوتی ہیں، اخباروں میں آئے دن اس طرح کی خبریں دیکھنے میں آتی ہیں، تنہا دہلی میں تلک کے معاملہ پر روزانہ ایک عورت کی ہلاکت کا واقعہ پیش آتا ہے۔ حکومت نے ہر چند اس کے لئے قوانین بنائے اور کوششیں کیں، مگر یہ مصیبت ٹلتی نظر نہیں آتی، ستم ظریفی یہ ہے کہ سماجی تنظیمیں مسلمان عورتوں کی فرضی مظلومیت پر مگر مچھ کے آنسو بہا بہا کر اسلام کو بدنام کرنے کی جان توڑ کوشش کرتی ہیں، مگر دوسروں کی آنکھ میں تنکے تلاش کرنے والی ان تنظیموں کو اپنے آنکھ کی موٹی سی لکڑی نظر نہیں آتی۔

قتل اور خودکشی کی بہت سی وارداتیں اس وجہ سے بھی ہوتی ہیں کہ ہندو سماج میں شادی ہو جانے کے بعد مرد اور عورت میں جدائی اور طلاق کا تصور نہیں ہے، اس لئے جب مرد عورت سے دامن چھڑانا چاہتا ہے تو اسے مار ڈالتا ہے، اور جب عورت اپنے شوہر سے زِچ ہو جاتی

ہے تو خودکشی کرلیتی ہے، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر ہی کو مار ڈالتی ہے۔

اسلام نے مسلمانوں کو ان دونوں معاملات میں جو تعلیمات دی ہیں وہ بڑی صاف اور سادہ ہیں، مرد و عورت گواہوں یا مجمع کے سامنے صرف زبانی اقرار کے بعد شوہر اور بیوی ہو جاتے ہیں، اسلام نے دونوں میں سے کسی پر کوئی مالی ذمہ داری نہیں رکھی ہے۔ صرف شوہر پر مہر کے نام سے اس کی حیثیت کے مطابق ایک معمولی سی رقم عائد کی ہے، جسے وہ اپنی بیوی کو دیگا، اور اس مہر کے بارے میں بھی یہ گنجائش رکھی ہے کہ وہ حسب استطاعت چاہے تو فوراً ادا کردے، چاہے تو زندگی میں کبھی بھی ادا کرے، پھر شادی کے بعد شوہر کی طرف سے کھانے کی جو دعوت کی جاتی ہے اس کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے اپنے دو چار دوستوں کو کوئی چیز چند لقمے کھلا دے، بس یہ ہے اسلام کا حکم، اس کے بعد آدمی کی اپنی مرضی ہے کہ اس کے پاس مال و دولت ہے تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق تھوڑا یا زیادہ کتنا خرچ کرے۔

اسی طرح اسلام نے اگر چہ اس بات کو بہت برا مانا ہے، بلکہ اجازت والی چیزوں میں سب سے زیادہ برا مانا ہے کہ شوہر بیوی کو طلاق دے، لیکن بہر حال اس کی گنجائش رکھی ہے کہ اگر مرد و عورت میں نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو ہر طرح سمجھنے سمجھانے اور دونوں خاندان کے لوگوں کی طرف سے زور اور دباؤ ڈالنے کے بعد آخری چارۂ کار کے طور پر شوہر طلاق دیدے، یا عورت خلع کرالے، یہ بات چاہے جتنی بری ہو لیکن قتل اور خودکشی سے تو بہر حال کم بری ہے۔ اس لئے طلاق کا قانون درحقیقت انسانیت پر اسلام کا احسان عظیم ہے، اور دنیا کی وہ ساری قومیں جو طلاق کی قائل نہیں تھیں اب قائل ہوتی جارہی ہیں، مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ آج ان دونوں معاملات میں یعنی نیز اونچ اور طلاق کے معاملات میں مسلمانوں کا عمل ٹھیک اسلامی ہدایات و تعلیمات کے مطابق نہیں ہے، اس لئے اس کا پورا فائدہ بھی انہیں نہیں مل پا رہا ہے،

پھر بھی دوسروں کے مقابل ان کا سماج بہت محفوظ ہے، اور ان میں آپ ان معاملات کی وجہ سے قتل اور خودکشی کی واردات ڈھونڈھے سے بھی بمشکل ہی پاسکیں گے۔

ہنسا (تشدد) کے ابتک جو اسباب ذکر کئے گئے ہیں ان کے علاوہ تشدد کے معاشی اور نفسیاتی اسباب بھی ہیں، نفسیاتی اسباب میں حسد، کینہ، عداوت، ظلم، تعدی اور طاقت کی نمائش کا ذوق وغیرہ وغیرہ ہیں۔ اور ان معاشی اور نفسیاتی اسباب کے بارے میں بھی اسلامی تعلیمات ہی سب سے زیادہ صحیح ومعتدل اور ساری بیماریوں کا علاج ہیں، مگر ان سب پر گفتگو کی گنجائش نہیں، البتہ ہنسا اور تشدد کے تعلق سے مزید ایک بات کہہ کر گفتگو ختم کرنا چاہتا ہوں، اور یہ بات ہے انفرادی تشدد کے بجائے اجتماعی تشدد کی، یعنی ملکوں اور قوموں کے درمیان جنگ وجدل کی۔

انسانی تاریخ کو کھنگالئے تو اندازہ ہوگا کہ جس طرح کے اسباب انفرادی تشدد کو جنم دیتے ہیں اسی طرح کے اسباب سے جنگوں اور لڑائیوں کے بھی دروازے کھلتے ہیں۔ کوئی قوم کسی قوم سے بڑی بن کر رہنا چاہتی ہو، اس کی خوبیوں پر حسد سے جلتی ہو اور اس کی خوشحالی اور بہترین پیداوار پر للچائی ہوئی نظر رکھتی ہو، تو موقع تلاش کر کے اور بہانہ پیدا کر کے اس پر حملہ آور ہوتی ہے، اور اسے مار کاٹ کر اور لوٹ کھسوٹ کر تباہ وبرباد کر دالتی ہے، یہ بات اس وقت سے ہوتی آرہی ہے جب سے انسان کی تاریخ معلوم ہے، اور اب تک ہو رہی ہے، اور ہر طرح کے بین الاقوامی معاہدوں اور کوششوں کے باوجود اس کے کچھ آثار نظر نہیں آتے کہ اسے روکا جاسکے گا۔ ۱۹۷۱ء کے اخیر میں بنگلا دیش کی جنگ ہوئی تو اقوام متحدہ کے ۱۰۴ ممالک نے ہندوستان کے اقدام کو غلط قرار دیتے ہوئے اس سرزمین کو خالی کر دینے کی قرارداد پاس کی، صرف چار ووٹ اس قرارداد کے خلاف گئے جس میں ایک خود ہندوستان کا تھا، ایک روس کا، اور دو روس کے

حاشیہ برداروں کا، پھر ہیگ کی عالمی عدالت نے بھی ہندوستانی اقدام کو غلط قرار دیتے ہوئے فیصلہ کیا کہ بنگلا دیش کی تشکیل خلاف قانون ہے، مگر ہندوستان نے ساری دنیا کے فیصلے کو ٹھکرا کر وہی کیا جو اسے کرنا تھا۔

اسی طرح روس نے افغانستان پر دھاندلی سے قبضہ کرلیا ہے، وہاں کے باشندے اپنی آزادی کے لئے موت وزندگی کی لڑائی لڑ رہے ہیں، اور ساری دنیا ہر سال قرارداد پاس کرتی ہے کہ روس افغانستان سے نکل جائے مگر وہ سب کے فیصلوں کو روند کر افغانستان میں جما ہوا ہے، عربوں کی سرزمین پر طاقت کے زور سے اسرائیل کو بسایا گیا ہے، پھر وہ مدتوں سے اقوام متحدہ کی قراردادیں رد کرکے عربوں کی مزید زمینیں ہڑپ کئے ہوئے ہے، اور انہیں خالی کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

یہ تین مثالیں میں نے صرف اس مقصد کے لئے پیش کی ہیں کہ آج بھی دنیا میں ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' پر عمل ہو رہا ہے، اور آپ یقین رکھئے کہ آئندہ بھی اسی پر عمل ہوگا۔ مسلمانوں کو چھوڑ کر دنیا کی تاریخ میں آج تک کوئی ایسی قوم پیدا نہیں ہوئی جس نے طاقتور ہو کر کمزوروں کو لوٹنے کھسوٹنے اور قتل وغارت کرنے کے بجائے عدل وانصاف دیا ہو، یہ صرف مسلمان ہیں جو بین الاقوامی اسٹیج پر کھڑے ہوکر دنیا کی ساری قوموں کو مخاطب کرکے کہہ سکتے ہیں کہ ؎

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

اس حقیقت کے پیش نظر اسلام نے مسلمانوں کو کبھی اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رکھا کہ دنیا سے جنگ ختم ہوسکتی ہے، اس لئے اسلام نے اس مفروضے کے چکر میں ڈالنے کے بجائے مسلمانوں کو جنگ کے ایسے اصول اور ضابطے دیئے کہ تباہی و بربادی کی یہ سب سے بری اور

بڑی لعنت بھی انسانیت کی خدمت کا ذریعہ بن گئی، یعنی جتنے اسباب کے تحت دنیا میں جنگ ہوا کرتی تھی اسلام نے مسلمانوں کو ان سب سے روک کر صرف دو ایسی منصفانہ وجہوں کے تحت جنگ کی اجازت دی کہ اگر دنیا کی دوسری قومیں بھی طے کرلیں کہ صرف انہی دونوں وجہوں کی بنا پر جنگ کریں گی تو سرے سے جنگ ہی نہ ہوگی۔ اسلام کے نزدیک جنگ کی ایک وجہ یہ ہے کہ کوئی ملک یا قوم ان پر حملہ کردے اور مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کے لئے جنگ پر مجبور ہونا پڑے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ سے روکا جائے، یعنی مسلمانوں کو اسلام پر عمل نہ کرنے دیا جائے، ان کے مبلغین کو اسلام کی تبلیغ سے روک دیا جائے، اور جو لوگ مسلمان ہونا چاہیں یا مسلمان ہو جائیں، انہیں قتل و قید کر کے یا مار پیٹ کر اسلام سے دور رکھنے یا غیر مسلم بنانے کی کوشش کی جائے، ان دونوں وجہوں یعنی مسلمانوں پر حملہ یا اللہ کی راہ سے روکنے کے علاوہ اور کسی وجہ سے اسلام لڑائی کی اجازت نہیں دیتا، پھر ان دو صورتوں میں بھی اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ پہلے دوسرے فریق سے گفت و شنید کے ذریعہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی جائے اور ہتھیار کا سہارا صرف اس وقت لیا جائے جب کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہ رہ جائے۔ پھر اگر جنگ چھڑ جائے تو دوران جنگ اور بعد از جنگ مسلمانوں کو ایسے ضابطوں کا پابند بنایا گیا ہے کہ جنگ کے معاملے میں اس سے بہتر ضابطے کا تصور نہیں کیا جا سکتا، یعنی مسلمانوں کو صرف لڑنے والوں سے لڑنے اور انہی کو مارنے کی اجازت ہے، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، سادھوؤں، راہبوں اور غیر متعلق لوگوں پر ہاتھ اٹھانے اجازت نہیں، مویشیوں، کھیتیوں، مکانات، اور باغات وغیرہ کو جلانے، اجاڑنے اور تاخت و تاراج کرنے کی بھی قطعی ممانعت ہے، قیدیوں میں سے صرف ان لوگوں کو سزائے موت دیئے جانے کا ثبوت ہے جو صرف سپاہی نہ تھے بلکہ فساد کی جڑ اور جنگی مجرم تھے۔

پھران ساری پابندیوں اوراحتیاط کے ساتھ بھی جنگ کی اجازت صرف اسی وقت تک کے لئے ہے جبتک کہ دوسرا فریق صلح کی طرف نہیں جھکتا، اور جنگ ہی پر اڑا ہوا ہے، ورنہ جونہی دوسرا فریق صلح پر آمادہ ہوٗاسلام جنگ بند کردینے کا حکم دیتا ہے،قرآن میں ارشاد ہے:

﴿وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله﴾ (الانفال:٦١)۔

اگروہ (یعنی مخالفین) صلح کی طرف جھکیں توتم بھی صلح کے لئے جھک جاؤاوراللہ پر بھروسہ کرو۔

اس حکم کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے پوری طرح چنگل میں آئے ہوئے دشمنوں بلکہ غداروں تک کی بھی درخواست صلح فوراً منظور کرلی ہے، اور ہمیشہ نہایت فیاضی، رعایت اور کشادہ دلی سے کام لیا ہے، پیغمبرﷺ کے تعلق سے صلح حدیبیہ کا واقعہ اور ہندوستان کے تعلق سے جے پال وانند پال کے لئے سبکتگین اور محمود غزنوی کی معافیاں اور رعایتیں اس کی واضح مثالیں ہیں۔

اسلامی قوانینِ جنگ کے متعلق ان مختصر اشارات سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ اسلام کے نزدیک جنگ کا معاملہ مذہب کے پھیلاؤ یا جارحیت سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ یہ خالصۃ بین الاقوامی امن وامان اور مذہبی خودمختاری وآزادیٔ فکر کے قیام سے تعلق رکھتا ہے، واقعات کی حتمی شہادت بھی یہی ہے، اسلام سے پہلے کا عرب لڑائیوں اور قتل وغارت گری کے لئے بہت مشہور ہے، میں اس سلسلہ میں ایک واقعہ پیش کررہاہوں، اسلام کی آمد سے کچھ پہلے دو چچازاد قبیلوں بکراور تغلب کے درمیان صرف اتنی سی بات پر جنگ چھڑگئی کہ ایک قبیلہ کے ایک آدمی کا اونٹ دوسرے قبیلہ کے ایک آدمی کی چراگاہ میں چلا گیا تھا، پھراس جنگ نے اس قدر طول پکڑا کہ رہ رہ کر چالیس برس تک جنگ ہوتی رہی، اور مجموعی طور پر فریقین کے کوئی ستر ہزار آدمی یعنی

اوسطاً ہر قبیلے کہ ۳۵، ۳۵ ہزار آدمی مارے گئے، لیکن پھر بھی کوئی قبیلہ دوسرے کے سامنے جھکنے اوراس سے صلح کرنے پر آمادہ نہ ہوا، حالانکہ دونوں اصلاً ایک ہی قبیلہ کی دوشاخ تھے۔

اب آپ ایک طرف عربوں کی یہ اکڑ اوران کا یہ جنگجویانہ مزاج دیکھئے اور دوسری طرف اسلامی جنگوں اور اسلام کے پھیلاؤ کو دیکھئے، نبی کریم ﷺ کے دور میں جنگ کے جتنے واقعات پیش آئے، ان سب میں مسلمان اوران کے مخالفین دونوں کو ملا کر مجموعی طور پر جو لوگ قتل کئے گئے ان کی تعداد صرف ۱۰۱۸ ہے، ۲۵۹ مسلمان اور ۷۵۹ غیر مسلم [1]، لیکن نبی ﷺ ہی کے دور میں پورے عرب کے اندر اسلام پھیل گیا۔ یعنی شمال مغرب اور شمال مشرق میں شام وعراق کی سرحدوں سے لیکر بحر ہند خلیج اور بحر قلزم کے سواحل تک ہر جگہ اسلام پھیل گیا، اوراس پورے علاقے پر اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ سوال یہ ہے کہ جس عرب کے صرف دو قبیلے اپنے ۳۵، ۳۵ ہزار آدمیوں کی جان گنوا کر بھی اپنے مخالف کے سامنے سر جھکانے پر تیار نہ ہو سکے۔ کیا اس پورے عرب کے سینکڑوں قبائل کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر ان سب کے صرف ۷۵۹ آدمیوں کو قتل کر کے انہیں ان کی مرضی کے خلاف ایک دوسرا دین و مذہب اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا، ہرگز نہیں۔ اس لئے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام اپنے پھیلاؤ کی بنیاد اپنے سادہ اور سچے اصولوں، خدا پرستی کی بہترین تعلیمات اور ہر طرح کے سماجی ومعاشی اور معاشرتی عدل وانصاف اوراپنے مبلغین کی سچی تبلیغی خدمات پر رکھتا ہے۔ مگر اس مقصد کے لئے طاقت کا استعمال نہیں کرتا، بلکہ طاقت کا استعمال صرف اس وقت کرتا ہے جب کسی کی جارحیت ختم کرنی ہو، یا مذہب کے بارے میں لوگوں کی خودمختاری کے اندر کسی طاقت کی مداخلت بند کرانی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص جو حق وانصاف کا مطلب جانتا ہے وہ

---

(۱) رحمۃ للعالمین جلد دوم۔

اسے نہ تو ظلم کہہ سکتا ہے نہ ہنسا (تشدد)۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تشدد کی اس خوفناک صورت یعنی یعنی جنگ کو کم سے کم کرنا ہو یا مٹانا ہو تو یہ کام ان اصولوں کا سہارا لئے بغیر ممکن نہیں، جنھیں اسلام نے اب سے چودہ سو برس پہلے طے کر کے جنگ کی بھٹی میں سلگتی ہوئی دنیا کو امن وامان کا گہوارہ بنا دیا تھا۔

سوال وجواب

اسلام اور اہنسا کے تعلق سے یہ چند گزارشات ہیں جنھیں وقت مقررہ کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے اختصار سے پیش کیا تھا۔اس کے بعد تقریر کے خاتمہ پر چائے نوشی کی خاطر چند منٹ کے لئے مجلس برخاست ہوئی اور پھر دوبارہ منعقد ہوگئی اور سول و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کاشی ودیا پیٹھ (کاشی یونیورسٹی) کے وائس چانسلر جناب راجا رام شاستری صدر مجلس تھے۔ سب سے پہلے انہی نے سوال کیا۔ان کا سوال یہ تھا:

سوال: آپ کی تقریر سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی پر ظلم وتشدد ہو یا سے قتل کر دیا جائے تو اسلام اس کو یا اس کے اولیاء کو پورا پورا بدلہ دلانے کا ذمہ دار ہے۔البتہ اگر وہ خود چاہیں تو اپنی آزاد مرضی سے مجرم کو معاف کر سکتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مجرم کو معاف کر دینا بہتر ہے یا بدلہ لینا بہتر ہے، یا دونوں برابر ہیں؟ اور اسی ضمن میں دوسرا سوال یہ ہے کہ جو شخص بدلہ لیتا ہے اور جو شخص معاف کر دیتا ہے، وہ دوں برابر ہیں یا کسی کا درجہ دوسرے سے بلند ہے؟ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب: مجرم کو معاف کر دینا بہتر ہے، قرآن میں ارشاد ہے:

﴿ وإن عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خير

للصابرین﴾(سورۃ النحل:۱۲۶)۔

اگر تم بدلہ لو تو ویسا ہی بدلہ لو جیسا تشدد تم پر کیا گیا ہے، اور اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے۔

البتہ اس موقع پر حکومت اور سماج کو یہ لحاظ رکھنا ہوگا کہ معافی کے نتیجہ میں مجرم کے اندر جرم اور ظلم کی جرأت و جسارت اور نہ بڑھ جائے۔ اگر اس کا اندیشہ اور ایسی علامات پائی جائیں تو اگر چہ مجرم سے انتقام نہیں لیا جائے گا لیکن کوئی ایسی سزا (مثلاً قید) دی جائے گی، یا کسی ایسی پابندی کا انتظام کیا جائے گا کہ دوبارہ جرم کا امکان کم سے کم رہ جائے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ معاف کر دینے والے کا درجہ بدلہ لینے والے سے بہتر ہے۔ یہ دنیا میں بھی اس کے معزز اور شریف النفس ہونے کی علامت ہے، اور آخرت میں بھی بلندیٔ درجات کا ذریعہ ہے۔

صدر مجلس کے ان دو سوالوں کے بعد مجلس کے ایک مسلمان ممبر نے سوال پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی، انھوں نے تاریخ کی ''بھول بھلیوں'' سے نکل کر معروضی انداز سے گفتگو کی بات کئی بار دہرائی، اور اسلام کے ابتدائی دور کے بعض حادثات کی طرف بھی اشارے کئے، مگر انھوں نے کوئی متعین سوال نہیں کیا، اس لئے میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ اپنے سوالات یا اعتراضات متعین فرما دیں تو میں ان کا جواب دوں، مگر اتنے میں ایک تیسرے صاحب نے جن کا اسم گرامی متّل تھا اپنے سوالات پیش کر دیئے۔ یہ سوالات جہاں تک اندازا ہوا مسلمان ممبر کی پیش کی ہوئی باتوں پر مبنی تھے۔ البتہ اس میں متل صاحب کے اپنے تبصرے بھی شامل تھے۔ اس لئے اب انہی کے سوالات پیش کئے جا رہے ہیں۔

متل صاحب کا ارشاد تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب ابتدا ہی سے خونخوار تھے، اور اسلام

اپنی تعلیمات کے ذریعہ ان کی اس فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکا۔محمد صاحب کے زمانے میں جو جنگیں ہوئیں ان میں تو خیر ان کا مقابلہ دوسرے مذاہب کے لوگوں سے تھا،لیکن ان کے بعد جب پورا عرب مسلمان تھا تب بھی ان میں باہم لڑائیاں ہوتی رہیں،دوسرے اور تیسرے خلیفہ کو شہید کیا گیا۔حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما میں جنگ رہی،اور خود پیغمبر صاحب کے نواسے حضرت حسین کو کربلاء میں قتل کردیا گیا۔

جواب: اسلامی دور میں جو کچھ پیش آیا وہ عربوں کی خونخواری نہیں بلکہ فطری سادگی، انسانیت نوازی اور اصول پسندی کی دلیل ہے۔دوسرے خلیفہ کسی مسلمان یا عرب کے ہاتھ سے نہیں بلکہ ایک غیر مسلم ایرانی کے ہاتھ سے مارے گئے تھے،اگر ان میں فطری سادگی کے بجائے بادشاہوں جیسی ٹیپ ٹاپ ہوتی،اور باڈی گارڈ کا انتظام واہتمام ہوتا تو شاید اس کی نوبت ہی نہ آتی۔پھر یہ واقعہ انفرادی اور شخصی تھا،اس میں زیادہ سے زیادہ جو شبہہ کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ اس میں مدینہ کے اندر موجود ایرانیوں کی پس پردہ سازش رہی ہو،مگر ہر حال میں یہ خونخواری کسی مسلمان نے نہیں بلکہ غیر مسلم نے کی تھی۔

تیسرے خلیفہ کی شہادت کا بھی کئی پہلو قابل غور ہے۔میں چاہتا ہوں کہ واقعہ کی اصل صورت آپ کے سامنے رکھ دوں۔ایران میں اسلام کی آمد سے پہلے زمیں دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام کے ظلم و جبر کا یہ حال تھا کہ کسان اور کاشتکار تو نان شبینہ کو ترستے تھے۔مگر معمولی معمولی زمیں دار لاکھوں روپئے کے ہیرے جواہرات کا تاج پہنے بغیر گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔اس لوٹ کھسوٹ کی فضا میں جب اسلامی فوجوں نے ایران فتح کیا تو اسلامی تعلیمات کی سادگی،انصاف ومساوات اور مسلمانوں کا شریفانہ برتاؤ دیکھ کر،ایرانی عوام فوج درفوج مسلمان ہوگئے۔اس لہر کو دیکھ کر زمیں داروں اور جاگیر داروں نے محسوس کیا کہ اگر ہم

حلقہ بگوش اسلام نہ ہوئے تو ہماری آبرو عوام تو درکنار شاید غلاموں کے برابر بھی نہ رہ جائے گی۔ کیونکہ ایرانی عوام ہمارے قبضے سے آزاد ہوکر اور انصاف کے سائے میں آکر ہم سے سخت نفرت کریں گے۔ لہٰذا انھوں نے بھی بظاہر اسلام قبول کرلیا۔ مگر ان بڑے لوگوں کی ایک خاصی تعداد ایسی تھی جو اسلام کو اپنے لئے باعث رسوائی سمجھ رہی تھی، اور دو بدو جنگ میں ناکام ہونے کے سبب کوئی پس پردہ تحریک چلانے اور اسلامی نظام کو تلپٹ کر دینے کی تدبیر سوچ رہی تھی۔ اور یہی انداز فکر یہودیوں کا بھی تھا۔ ان دونوں گروہ کے چالباز لوگوں نے ملکر مجرموں اور حکومت کے سزا یافتہ بدمعاشوں کو اندر ہی اندر تیار کرنا شروع کیا۔ پھر خاندان رسالت کی محبت کا لبادہ اوڑھ کر سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے دام میں پھانسا، اس کے بعد خلیفہ المسلمین کے خلاف جھوٹے اور غلط الزامات کی تشہیر شروع کی، جس سے بہت سے اچھے دیندار و تقویٰ شعار اور سوجھ بوجھ رکھنے والے مسلمان بھی متاثر ہوگئے۔ ان سب نے دار الحکومت مدینہ کی طرف احتجاجی مارچ کیا، اور خلیفۃ المسلمین کے خلاف اپنے الزامات کی فہرست پیش کی۔ خلیفہ نے ان الزامات کا جواب دیا تو معلوم ہوا کہ ان کی کوئی اصل نہیں، اس کے بعد سارے مجمع نے مطمئن ہوکر واپسی کی راہ لی، مگر سازشیوں نے، کچھ دور جاکر اپنے خاص خاص آدمیوں کے قتل کے حکم کی جھوٹی دستاویز پیش کر کے مجمع کو پھر بھڑکا دیا، اور اس نے واپس آکر خلیفہ کا مکان گھیر لیا۔ گفتگو کے بعد ایک بار پھر واضح ہوگیا کہ الزام جھوٹا اور بناوٹی ہے۔ لیکن سازشیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خلیفۃ المسلمین کو شہید کر دیا۔

اس مختصر توضیح سے سمجھا جا سکتا ہے کہ تیسرے خلیفہ کی شہادت بھی عربوں یا مسلمانوں کی خونخواری کی علامت نہیں، کیونکہ یہ یہودیوں اور ایرانیوں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ دور جاہلیت میں عرب جس طرح کے خونخوار تھے اگر اسلام کے بعد بھی ان کی وہی کیفیت رہی ہوتی تو مدینہ

میں سرے سے کوئی شخص ایسی نیت سے قدم رکھنے کی جرأت ہی نہ کر سکتا تھا۔ اور خدانخواستہ وہاں پہنچ جاتا تو اتنا بڑا جرم کرنے کے بعد زندہ بچ کر جانہ سکتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس اتنا کچھ ہوجانے کے باوجود مدینہ کی فوج حرکت میں نہیں آئی، کیونکہ جب تک تیسرے خلیفہ زندہ تھے انھوں نے کارروائی کی اجازت نہ دی تھی۔ اور جب شہید کر دیئے تو نئے خلیفہ کے برسر اقتدار آنے اور ان کا فیصلہ صادر ہونے کی منتظر رہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اسلام لانے کے بعد دور جاہلیت کے جذبۂ خونخواری کو ایکدم اتار پھینکا تھا[1]۔

پھر حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ اور ان کے مخالفین کا جھگڑا بھی اسی بنیاد پر تھا۔ تیسرے خلیفہ کے قاتل ان کے لشکر میں شامل تھے۔ مخالفین کا مطالبہ تھا کہ ان سے قصاص لیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ ابھی حالات سازگار نہیں ہیں، اس پر مخالفین نے ان کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور حضرت علی نے انہیں باغی قرار دیکر فوج کشی کا فیصلہ کرلیا۔ اس فیصلہ میں اور اس کے بعد ہونے والی جنگ میں بھی سازشیوں کا پورا پورا ہاتھ تھا۔

اس توضیح سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ خونخواری یا لوٹ کھسوٹ کی جنگ نہ تھی، بلکہ اصولوں اور آدرشوں کی جنگ تھی، پھر اس جنگ کی بھی کیفیت یہ تھی کہ نہ کسی فریق نے دوسرے کا ساز وسامان لوٹا نہ کسی زخمی پر تلوار اٹھائی، نہ کسی واپس جانے والے کا پیچھا کیا۔ بلکہ حالت یہ تھی کہ اگر دونوں فریق کے بیچ میں عین لڑائی کے دوران کوئی غیر متعلق یا نہتا آدمی آکر کھڑا ہو گیا تو اس پر کسی بھی فریق نے ہاتھ نہ اٹھایا۔

اب آپ ایک طرف دور جاہلیت کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے کہ انھوں نے مذہبی طور پر چار مہینے حرام کے مانے تھے، (جسے اسلام نے بھی برقرار رکھا)۔ ان مہینوں میں وہ ادھر ادھر آمد ورفت

---

(۱) اب اندرا گاندھی کے قتل پر ہندوستان میں بھڑکنے والے ہنگامہ سے اس کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔

اور تجارت وغیرہ کرکے اپنی سال بھر کی ضروریات جمع کر لیتے تھے۔ باقی آٹھ مہینے کیفیت یہ رہتی تھی کہ ہر قبیلہ کا ایک علاقہ ہوتا تھا، وہ اپنی آبادی کے اس علاقے سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ باہر قدم رکھتے ہی دوسرے قبیلے کے لوگ اسے لوٹ لیتے، اور قتل کر ڈالتے، بلکہ اپنی آبادی کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی کوئی قبیلہ محفوظ نہ رہتا تھا۔ دوسرا قبیلہ جونہی یہ محسوس کرتا کہ ہم اسے ہرا سکتے ہیں اس پر حملہ کر دیتا۔ اور عورتوں، بچوں اور بوڑھوں جوانوں میں تمیز کئے بغیر جس کو پاتا قتل کر ڈالتا، اور جو کچھ پاتا لوٹ لیتا۔

ایک طرف جاہلیت کی یہ لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت دیکھئے اور دوسری طرف اسلامی جنگوں کا حال دیکھئے کہ وہاں میدان جنگ سے باہر جنگ کا کوئی اثر نہیں۔ ایک عورت تنہا اونٹ پر بیٹھ کر عراق سے مکہ آتی اور جاتی مگر اس پر کوئی چوں کرنے والا نہ تھا۔ پوری دنیائے اسلام میں کہیں کسی کو جان یا مال کا خطرہ نہ تھا۔ اور خود میدان جنگ میں بھی صرف فوجیں ایک دوسرے سے لڑ رہی تھیں۔ غیر متعلق آدمی اگر دونوں فوجوں کے بیچ سے گزر جائے تو بھی اسے کوئی کچھ کہنے والا نہ تھا۔ آپ سوچئے کہ اسلامی دور کی ان لڑائیوں کو جاہلی دور کی لوٹ کھسوٹ سے کیا تعلق؟ یہ خالص اصولوں کی جنگ تھی اور وہ خالص غارت گری۔

۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء کے حج کے بعد محرم ۱۴۰۰ھ میں سعودی حکومت سے بغاوت کرکے جن لوگوں نے خانۂ کعبہ پر قبضہ کیا تھا، ان کے ساتھ ہونے والی جنگ کا بھی ٹھیک یہی نقشہ تھا۔ باغیوں اور سعودی فوج کے مورچوں کے درمیان جو میدان تھا اس میں غیر فوجی لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ عام لوگ اس میدان سے گزر کر مسجد حرام کی باہری دیوار میں لگی ہوئی بڑی بڑی جالیوں کے راستے مسجد حرام میں گھس جاتے تھے، اور اپنے آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اسی راستے سے واپس بھی آجاتے تھے۔ مگر ان پر نہ سعودی فوج گولی چلاتی تھی نہ باغی۔ کئی افراد

اس وقت بھی آئے گئے جب باغی مسلسل گولیاں چلارہے تھے۔مگرانہوں نے کسی بے وردی انسان کونشانہ نہیں بنایا[1]۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی اسی طرح کے سیاسی طالع آزماؤں کی سازش کا نتیجہ ہے، جنھوں نے محض مکروفریب کے لئے اسلام قبول کرلیا تھا۔اور چالباز اتنے تھے کہ خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوشہید کرکے یزید کو بدنام کردیا، جس سے عام مسلمان آج تک متاثر ہیں، ان حقائق پرنظر رکھنے کے بعد یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان حکمراں پس پردہ سازشوں بروقت پکڑ نہ سکے جن سے بہت سے خطرناک حادثوں نے جنم لیا،مگراس کا دوش اسلام کونہیں دیا جاسکتا۔نہ ان خونریزیوں کواسلامی تعلیم کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ہاں ان اندوہناک واقعات کے دوران انسانیت وشرافت جوکچھ پائی گئی وہ البتہ اسلامی تعلیم کا نتیجہ تھی۔

میری ان گزارشات کاتعلق متل صاحب کے اصل سوال اور گفتگو کے مرکزی نقطے سے تھا۔متل صاحب نے ضمناً اوربھی کئی باتیں ایسی کہی تھیں جوغلط فہمی پرمبنی تھیں، میراارادہ تھا کہ اس اصل سوال کا جواب مکمل ہوچکنے کے بعد باقی ضمنی باتوں کے متعلق بھی اصل حقائق پیش کروں گا۔مگر چونکہ وقت ختم ہو چلا تھا اس لئے جناب راجارام شاستری صاحب نے آخری کلمات کہے۔انھوں نے بہت صفائی کے ساتھ کہا کہ ابتک ہمیں صرف ایک بات بتائی جاتی تھی اور ہمارے سامنے تصویر کا صرف ایک رخ آتا تھا،اور ظاہر ہے کہ جب ایک ہی بات بتائی جائے تو دوسری بات ذہن میں آئے گی کیسے؟ مگر آج مولانا نے تصویر کا دوسرارخ پیش کردیا ہے،اور بڑی صفائی اور وضاحت سے پیش کردیا ہے،اس لئے اس پہلو پر واقعۃً غور کرنے کی ضرورت ہے۔

---

(۱) یہ ٹکڑا اسلامی جنگ کی نوعیت سمجھنے کے لئے بعد میں بڑھادیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صوبائی جمعیت اہل حدیث ممبئی اپنے مقصد وجود اور مشن کی تکمیل میں بحمد للہ بساط بھر سرگرم عمل ہے اور خالص اسلام (کتاب وسنت) کی نشر واشاعت، دعوت الی اللہ، اصلاح نفوس، اصلاح ذات البین اور تعلیم وتربیت سے متعلق سرگرمیوں میں اپنا کردار نبھانے کی بھرپور سعی کر رہی ہے۔ ذیل میں اس کی سرگرمیوں کا ایک خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

- ☆ ماہانہ تربیتی اجتماعات کا انعقاد
- ☆ جلسے
- ☆ انفرادی ملاقاتیں اور دعوتی دورے
- ☆ ہینڈ بل، اشتہارات اور کتابوں کی اشاعت
- ☆ مفت کتابوں کی تقسیم
- ☆ مکاتب کا ماہانہ تعاون
- ☆ ضرورت مند افراد کا تعاون
- ☆ مصائب وحادثات سے دوچار پریشان حال لوگوں کا تعاون
- ☆ نزاعات کے تصفیہ کے سلسلے میں تگ ودو
- ☆ دعاۃ کی تربیت کا اہتمام وغیرہ

دینی شعور رکھنے والے تمام غیرت مند افراد سے دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ مذکورہ مشن کی تکمیل میں جمعیت کا بھرپور تعاون فرمائیں۔ جزاھم اللہ خیراً

SUBAI JAMIAT AHLE HADITH, MUMBAI